نظم

''نظم'' عربی زبان کا لفظ ہے۔ لُغت میں اس کے معنی ہیں ''لڑی میں موتی پرونا''۔ اس کے دوسرے معنی ہیں ''انتظام، ترتیب، آرائش''۔ یہ مجازی معنی ہیں اور پہلے معنی سے برآمد ہوئے ہیں۔ ادبی اصطلاح کے طور پر ''نظم'' کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو یہ لفظ نثر کی ضد کے طور پر بولا جاتا ہے۔ یعنی ہر وہ کلام جو نثر نہ ہو نظم ہے۔ نظم کا دوسرا مفہوم مخصوص و محدود ہے۔ اس کے مطابق نظم شاعری کی اس صنف کو کہتے ہیں جس میں کسی خاص موضوع پر تسلسل کے ساتھ اظہارِ خیال کیا جائے۔

نظم عام طور پر کسی ایک موضوع سے متعلق ہوتی ہے، خاص صورتوں میں کسی نظم میں ایک سے زیادہ موضوعات بھی ہو سکتے ہیں لیکن یہ سب کسی بنیادی موضوع سے مربوط ہوتے ہیں۔ نظم کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے جس کے گرد پوری نظم گردش کرتی ہے۔ ارتقا یعنی موضوع کا تسلسل اور پھیلاؤ بھی نظم کی اہم خصوصیت ہے۔ طویل نظموں میں ارتقا واضح ہوتا ہے جب کہ مختصر نظموں میں یہ اکثر و بیشتر ایک تاثر کی شکل میں ابھرتا ہے۔ نظم کی ان خصوصیات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں ''غزل'' کے علاوہ شاعری کی جتنی اصناف ہیں وہ سب نظم میں داخل ہیں لیکن اپنی الگ الگ خصوصیات کی بنا پر کچھ اصناف کے نام متعین ہو گئے ہیں۔ مثلاً قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، قطعہ وغیرہ۔

صنفِ سخن کے لحاظ سے نظم کی اصطلاح ایک جدید تصور ہے۔ اسی لیے اکثر نظم کے لیے ''نظم جدید'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ نظم کے لیے نہ تو ہیئت کی کوئی قید ہے اور نہ موضوع کی۔ موجودہ دور میں ہیئت کے اعتبار سے نظم کی تین قسمیں مقرر کی گئی ہیں:

پابند نظم:

ایسی نظم جس میں بحر کے استعمال اور قافیوں کی ترکیب میں مقررہ اصولوں کی پابندی کی گئی ہو، پابند نظم کہلاتی ہے۔ مُربع، مُخمّس، مُسدّس، ترکیب بند، ترجیع بند، گیت، وغیرہ بھی پابند نظم کی ہی مختلف شکلیں ہیں۔

نظم مُعَرّا:

ایسی نظم جس کے تمام مصرعے وزن کے لحاظ سے برابر ہوں، مگر قافیہ نہ ہو، نظمِ معرّا کہلاتی ہے۔

آزاد نظم :

ایسی نظم جس میں نہ تو قافیے کی پابندی کی گئی ہو اور نہ بحر کے استعمال میں مروّجہ اصولوں کا لحاظ رکھا گیا ہو بلکہ مصرعے چھوٹے بڑے ہوں، آزاد نظم کہلاتی ہے۔ انگریزی میں آزاد نظم کے لیے Free Verse کی اصطلاح رائج ہے۔ اردو میں آزاد نظم کا رواج انگریزی نظم کی تقلید کے باعث ہوا۔19 ویں صدی کے اواخر میں، جب ہندوستان میں انگریزوں کا عمل دخل بڑھا اور انگریزی زبان وادب کے اثرات پھیلنے لگے تو ان کے نتیجے میں آزاد نظم کا چلن بھی اردو میں عام ہوا۔ روایت کی پاسداری کرنے والوں نے اردو میں آزاد نظم کی قبولیت کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا لیکن، رفتہ رفتہ آزاد نظم نے ہماری ادبی تاریخ میں اپنی مستقل جگہ بنالی۔ ان دنوں نظم مُعرّا اور آزاد نظم کے ساتھ ساتھ نثری نظم بھی اردو میں عام ہوتی جارہی ہے۔

علی حیدر نظمؔ طباطبائی

1853 تا 1933

نظمؔ طباطبائی لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ نظمؔ طبا طبائی کی والدہ لکھنؤ کے نواب معتمدالدولہ آغا میر کے خاندان سے تھیں۔ اور آغا میر لکھنؤ کے نواب غازی الدین حیدر کے وزیراعظم تھے۔ نظمؔ طبا طبائی نواب واجد علی شاہ کی بیوی بوٹا بیگم کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ اِسی رشتہ کی وجہ سے وہ 1868 میں اپنے والد کے ساتھ مٹیا برج (کلکتہ) چلے گئے تھے۔ وہیں انھوں نے درسِ نظامی کی تعلیم مکمل کی۔ 1887 تک نظمؔ کلکتہ میں ہی مختلف ملازمتیں کرتے رہے لیکن 1887 میں تلاشِ معاش کے سلسلے میں حیدرآباد پہنچے اور پھر اخیر عمر تک وہیں رہے۔ حیدرآباد میں انھوں نے کئی ملازمتیں کیں۔ کتب خانہ آصفیہ کے مہتمم رہے۔ نظام کالج حیدرآباد میں پہلے عربی، فارسی کے لکچرر اور پھر اردو کے استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1918 میں وہ دارالترجمہ حیدرآباد سے وابستہ ہو گئے اور پھر اخیر تک یہاں مختلف علمی او رادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ دارالترجمہ میں ملازمت کے دوران انھوں نے کئی کتابوں کے ترجمے کیے۔ یہاں سے شائع ہونے والی کتابوں پر نظر ثانی کی اور مختلف علوم کی اصطلاحات وضع کرنے میں بھی انھوں نے اہم حصّہ لیا۔ ان کا انتقال حیدرآباد میں ہوا۔

نظمؔ طباطبائی وسیع المطالعہ شخص تھے۔ انھیں اردو کے علاوہ عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔ فلکیات اور علمِ عروض سے انھیں خصوصی دل چسپی تھی۔

اردو ادب میں نظمؔ طباطبائی دو وجہوں سے خاص طور پر مشہور ہیں اور ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ایک تو یہ کہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے 1901 میں دیوانِ غالبؔ کی مکمل شرح حیدرآباد سے شائع کی۔ اس شرح کا معیار اور علمی سطح خاصی بلند ہے۔ اس میں خالص علمی انداز میں غالبؔ کے اشعار کا تنقیدی محاکمہ پیش کیا گیا ہے اور محاسنِ شعر کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ کئی جگہ خامیوں کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔

نظمؔ کی شہرت کا دوسرا سبب ان کا منظوم ترجمہ ''گورِ غریباں'' ہے۔ انگریزی زبان کے شاعر تھامس گرے (Thomas Gray)

کی 32 بندوں پر مشتمل مشہور نظم نوحہ (Elegy written in a Country Church yard) کا منظوم ترجمہ نظؔم طبا طبائی نے جس فنی اہتمام اور ہنرمندی سے کیا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ اس منظوم ترجمے کا عنوان انھوں نے ''گورِغریباں'' رکھا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ترجمے میں اصل نظم کا سوز اور درد انگیزی کی کیفیت برقرار ہے۔ نظؔم طباطبائی نے اس ترجمے میں نظم کی ہیئت کا ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ نظم کا ہر بند انگریزی اسٹینزا (Stanza) کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔ نظؔم طباطبائی نے قافیہ بندی کا نیا طرز اختیار کیا ہے۔

گورِ غریباں

وداعِ روزِ روشن ہے گجر شامِ غریباں کا
چراگاہوں سے پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے
قدم گھر کی طرف کس شوق میں اُٹھتا ہے دہقاں کا
یہ ویرانہ ہے، میں ہوں، اور طائر آشیانوں کے

.....

اندھیرا چھا گیا، دنیا نظر سے چُھپتی جاتی ہے
جدھر دیکھو اٹھا کر آنکھ اُدھر اک ہو کا ہے عالم
مگس لیکن کسی جا بھیر ویں بے وقت گاتی ہے
جرس کی دوُر سے آواز آتی ہے کبھی پیہم

.....

کبھی اک گنبدِ کہنہ پہ بوُمِ خانماں ویراں
فلک کو دیکھ کر شکووں کا دفتر باز کرتا ہے
کہ دنیا سے الگ اک گوشۂ عزلت میں ہوں پنہاں
کوئی پھر کیوں قدم اس کنجِ تنہائی میں دھرتا ہے

.....

نہ دیکھیں حال ان لوگوں کا ذلّت کی نگاہوں سے
بھرا ہے جن کے سر میں غرّہ توّابی و خانی
یہ ان کا کاسۂ سر کہہ رہا ہے کج کلاہوں سے
''عجب نادان ہیں وہ جن کو ہے عُجبِ تاجِ سلطانی''

خدا جانے تھے ان لوگوں میں کیا کیا جوہرِ قابل؟
خدا معلوم رکھتے ہوں گے یہ ذہنِ رسا کیسے؟
خدا ہی کو خبر ہے کیسے کیسے ہونگے صاحب دل؟
خدا معلوم ہوں گے بازوے زور آزما کیسے؟

.....

نہ دیکھ ان استخواں ہاے شکستہ کو حقارت سے
یہ ہے گورِ غریباں، اک نظر حسرت سے کرتا جا
نکلتا ہے یہ مطلب لوحِ تربت کی عبارت سے
''جو اس رستے گزرتا ہے تو ٹھنڈی سانس بھرتا جا''

.....

حقیقت غور سے دیکھی جو ان سب مرنے والوں کی
تو ایسا ہی نظر آنے لگا انجامِ کار اپنا
انھی کی طرح جیسے مل گئے ہیں خاک میں ہم بھی
یونہی پرسانِ حال آ نکلا ہے اک دوستدار اپنا

.....

یہ اُس سے ایک دہقانِ کہن سال آ کے کہتا ہے
کہ ہاں ہاں، خوب ہم واقف ہیں، دیکھا ہے اُسے اکثر
پھر اس کے بعد دل ہی دل میں کچھ غم کھا کے کہتا ہے
کہ اب تک پھرتا ہے آنکھوں میں پھرنا اس کا سبزے پر

.....

''وہ اس کا نور کے تڑکے ادھر گلگشت کو آنا''
''وہ پو پھٹنے سے پہلے آکے پھرنا سبزہ زاروں میں''
''وہ کچھ کم دن رہے اُس کا لبِ جو کی طرف جانا''
''وہ اس کا مسکرانا دیکھ کر شور آبشاروں میں''

.....

غرض کیا کیا کہوں، اک روز کا یہ ذکر ہے صاحب!
''کہ اس میداں میں پھرتے صبح دم اس کو نہیں دیکھا''
''ہوا پھر دوسرا دن، اور نظر سے وہ رہا غائب''
''خیاباں میں اُسے پایا، نہ دریا پر کہیں دیکھا''

.....

''پر اس کے تیسرے دن دیکھتا کیا ہوں جنازے کو''
''لیے آتے ہیں سب پڑھتے ہوئے کلمہ شہادت کا''
''تمھیں پڑھنا تو آتا ہوگا!'' آؤ پاس سے دیکھو''
''یہ اس کی قبر ہے اور یہ کتِابہ سنگِ تربت کا''

.....

''خدا بخشے اسے بس دوست کا رہتا تھا وہ جویا''
''تو نکلا دوست اک آخر خداوندِ کریم اس کا''
''اب اس کے نیک و بد کا ذکر کرنا ہی نہیں اچھا''
''کہ روشن ہے خدا پر عالمِ امید و بیم اُس کا''

(نظم طباطبائی)

مشق

لفظ و معنی

گجر	:	گھنٹہ، گھڑیال
دہقاں	:	گاؤں میں رہنے والا، کسان
طائر	:	چڑیا، پرندہ
ہُو	:	سنّاٹا
جرس	:	گھنٹی
مگس	:	مکّھی
کتِابہ	:	سنگِ مزار پر لکھی ہوئی عبارت
پیہم	:	لگاتار، مسلسل
کہنہ	:	پرانا
بوم	:	اُلّو
خانماں	:	گھر
عزلت	:	تنہائی
پنہاں	:	پوشیدہ
استخواں	:	ہڈّی
گور	:	قبر
گل گشت	:	باغ کی سیر
خیاباں	:	چمن

غور کرنے کی بات

- زندگی کا انجام موت ہے۔ امیر و غریب سب ہی اس کی زد میں ہیں۔ مرنے والے کے اچھے کام اور اس کی محبتیں یاد رہ جاتی ہیں۔

سوالات

1. 'گورِ غریباں' کے اشعار کس انگریزی نظم کا ترجمہ ہیں؟
2. زمین میں کیسے کیسے لوگ دفن ہیں؟
3. لوحِ تربت کسے کہتے ہیں؟
4. کہن سال دہقاں کیا کہتا ہے؟

عملی کام

- نظم کے کسی ایک بند کو زبانی یاد کیجیے۔

اقبالؔ

1877 تا 1938

محمد اقبال پنجاب کے ایک مشہور شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگوں کا سلسلہ کشمیر سے ملتا ہے۔ ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ اقبال نے ابتدائی تعلیم مولوی میر حسن سے حاصل کی۔ 1893 میں انٹرنس پاس کیا، 1897 میں لاہور کے گورنمنٹ کالج سے بی۔ اے کیا۔ دو سال بعد 1899 میں ایم۔ اے کیا۔ مزید تعلیم کے لیے 1905 میں یورپ گئے۔ وہاں ڈاکٹریٹ اور بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ واپس آ کر لاہور میں وکالت شروع کی۔ کچھ عرصے تک یہی ان کا ذریعۂ معاش رہا۔ انھوں نے مختلف اوقات میں برطانیہ، جرمنی، اسپین، فرانس، فلسطین، افغانستان وغیرہ کا سفر کیا۔ وہ سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصّہ لیتے رہے۔ اِنھی سرگرمیوں نے ان کی شاعری میں بڑا تنوّع پیدا کیا۔ شاعری کی بدولت ان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔

اقبالؔ، اردو کے سب سے بڑے فلسفی شاعر ہیں۔ ان کا مشرقی اور مغربی فکر کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ قدیم اور جدید علوم پر وہ گہری نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے 20 ویں صدی کے ذہنی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل کا جائزہ انتہائی بالغ نظری کے ساتھ لیا ہے۔ اقبالؔ کی فکر کے بہت سے پہلو آج کی تہذیب کو سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں۔ خودی، عمل، عشق، زمان و مکاں اور انسانی جبر و اختیار کے موضوع پر اقبالؔ کے اشعار ہماری اجتماعی فکر کا حصّہ بن چکے ہیں۔ وہ جتنے بڑے مفکر تھے اتنے ہی بڑے فنکار بھی تھے۔ فارسی، انگریزی اور اردو میں اقبالؔ کی نظم و نثر کا ذخیرہ بکھرا ہوا ہے۔ ان کی اردو شاعری کے مجموعے یہ ہیں:

''بانگِ درا''، ''بالِ جبریل''، ''ضربِ کلیم'' اور ''ارمغانِ حجاز''! یہ نظم ''روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے''، ''بالِ جبریل'' سے لی گئی ہے۔

روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ　　مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ　　ایّامِ جدائی کے ستم دیکھ ، جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو، معرکۂ بیم و رجا دیکھ

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں　　یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں　　تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایّام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے　　دیکھیں گے تجھے دُور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیّل کے کنارے　　پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں　　آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں　　جنّت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے　　تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے
تو پیرِ صنم خانۂ اسرار ازل سے　　محنت کش و خوں ریز و کم آزار ازل سے
ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ

(اقبالؔ)

مشق

لفظ و معنی

معرکہ	:	جنگ
بیم	:	خوف، اندیشہ
رجا	:	امید
تصرّف	:	اختیار، قابو
ضو	:	روشنی، نور
شرر	:	چنگاری
پیہم	:	لگا تار، مسلسل
نالندہ	:	(رونے والا) رنج ونشاط کے نغمے سنانے والا
عود	:	ایک ساز جو سارنگی سے کسی قدر ملتا ہے
خوں ریز	:	خون بہانے والا
کم آزار	:	تکلیف نہ دینے والا
راکب	:	سواری

غور کرنے کی بات

- غور کرنے کی بات یہ ہے کہ پوری کائنات میں سب سے بہتر تخلیق انسان کی ہے۔ باقی تمام چیزیں اسی کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد پھر انسان کو اپنے منصب کا شعور بھی حاصل کرنا چاہیے۔
- اقبالؔ نے اس نظم میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ آدم کے جنت سے زمین پر بھیجے جانے کا قصہ بیان کیا ہے، آدم کی آمد پر زمین کی روح بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کرتی ہے۔ آدم کو ان کی حقیقت بتاتی ہے کہ تم ذرا غور سے اپنے وجود پر نظر

ڈالو۔ کائنات کی ہر شے صرف تمھارے لیے تخلیق کی گئی ہے۔ یہ سب تمھارے ہی محکوم ہیں۔ فرشتوں نے آدم کو ان کی عظمت کا احساس دلاتے ہوئے جنت سے رخصت کیا تھا۔ پھر دنیا میں اسی طرح ان کا شان دار اور پرتپاک استقبال بھی کیا جانا چاہیے تھا۔ نظم میں ارتقاے خیال کے ساتھ الفاظ کا انتخاب اور آہنگ بھی بہت مناسب ہے۔

سوالات

1. روحِ ارضی آدم کا استقبال کیوں کرتی ہے؟
2. تعمیرِ خودی کا کیا مطلب ہے؟
3. اس نظم کا بنیادی خیال کیا ہے؟
4. اقبالؔ کی شاعری کا امتیاز کیا ہے؟
5. ایسی نظم جس کے ہر بند میں پانچ مصرعے ہوں، اُسے کیا کہتے ہیں؟

عملی کام

- متضاد لکھیے

  ارضی فلک خورشید ازل محبت

- اس نظم کے پانچ مرکب الفاظ کی نشان دہی کیجیے۔

جمیلؔ مظہری

1904 تا 1980

جمیلؔ مظہری عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسۂ سلیمانیہ، پٹنہ میں حاصل کی۔ بعد میں کلکتے چلے گئے۔ وہاں ایم۔اے تک کی تعلیم حاصل کی۔ ابتدا میں اردو اخبارات میں کالم لکھتے رہے۔ 1950 سے 1974 تک شعبۂ اردو، پٹنہ کالج اور پٹنہ یونیورسٹی سے بہ حیثیت استاد منسلک رہے۔ ان کا انتقال مظفر پور میں ہوا۔ 1974 میں انھیں غالبؔ ایوارڈ برائے اردو شاعری عطا کیا گیا۔ ''نقشِ جمیل''، ''فکرِ جمیل''، ''عرفانِ جمیل''، ''آثارِ جمیل'' کے علاوہ ''جمیلؔ مظہری کے مرثیے'' اور ''مثنوی آب وسراب''، ان کی شعری کتابیں ہیں۔ ''شکست وفتح'' (ناولٹ) اور ''منثوراتِ جمیل مظہری'' ان کی نثری کتابیں ہیں۔ جمیلؔ مظہری نے اقبالؔ کے زیر اثر شاعری شروع کی اور بعد میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔

ارتقا

ہر حال میں مشیّت مُجھ کو بنا رہی ہے　　میں اُس کی قدرتوں کا شہکار بن رہا ہوں
خود اپنی جنتوں کی تخلیق کررہا ہوں　　خود اپنی زندگی کا معمار بن رہا ہوں
یہ جبر و قدر کی اک منزل ہے درمیانی　　مجبور تو ہوں لیکن مختار بن رہا ہوں

یہ راہ وہ ہے جس میں ہر سانس اک سفر ہے
منزل بھی راستہ ہے لغزش بھی راہبر ہے

حکمت کی رہبری میں پرواز کی امنگیں　　امکاں کے دائروں کو پھیلا کے بڑھ رہی ہیں
وہ قوتیں جو اب تک تحتِ شعور میں تھیں　　گہوارۂ خودی میں پروان چڑھ رہی ہیں
انجام کی بصیرت خواہش پہ حکمراں ہے　　آزادیاں خود اپنی زنجیر گڑھ رہی ہیں

پکڑے ہوئے ہیں دامن گو خیر و شر ہمارا
پابندیوں میں بھی ہے جاری سفر ہمارا

جذبات رفتہ رفتہ افکار بن رہے ہیں　　افکار کا نتیجہ کردار بن رہا ہے
ہمدردیوں کی شدّت انصاف بن رہی ہے　　پروردگی کا جذبہ ایثار بن رہا ہے
لغزش سے تجربہ ہے اور تجربے سے حکمت　　تحقیق ہو رہی ہے معیار بن رہا ہے

گمراہیوں سے ہوکر ہے راستہ ہمارا
تاریخ بن رہا ہے ہر نقش پا ہمارا

(جمیلؔ مظہری)

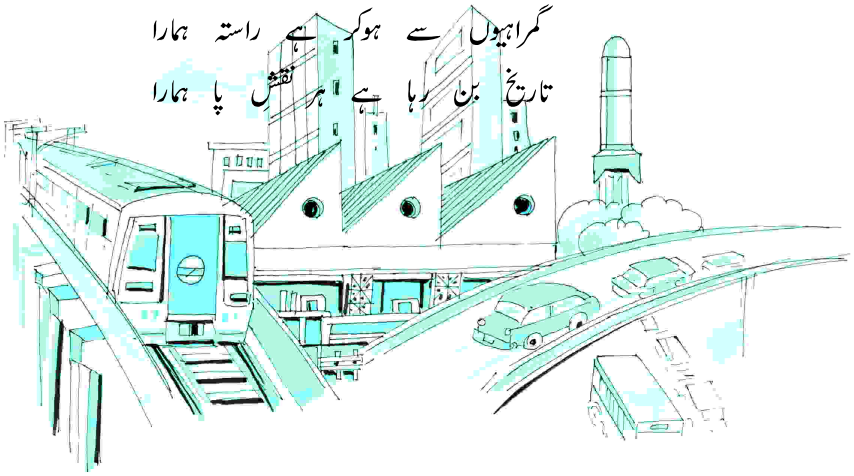

مشق

لفظ و معنی

ارتقا	:	تدریجی ترقی، سلسلے وار ترقی
مشیّت	:	اللہ کی مرضی
قدرت	:	غیبی طاقت
شہکار	:	بہترین کارنامہ، شاہ کار
تخلیق	:	پیدا کرنا، بنانا، وضع کرنا، فن پارہ
معمار	:	بنانے والا
جبر	:	انسان کا مجبور ہونا
قدر	:	انسان کا با اختیار ہونا، مختاری
حکمت	:	عقل، دانائی
رہبری	:	رہنمائی، راہ دکھانا
تحتِ شعور میں	:	شعور کی سطح سے نیچے
گہوارہ	:	پالنا، جھولا
خودی	:	اپنے وجود کا احساس
بصیرت	:	شعور، سوجھ بوجھ
خیر و شر	:	اچّھائی اور برائی
افکار	:	فکر کی جمع، خیالات، تصورات
پروردگی	:	پرورش کرنا
ایثار	:	قربانی

گمراہی	:	غلطی، راستے سے بھٹک جانا
نقشِ پا	:	پاؤں کے نشان

غور کرنے کی بات

- اس نظم کا مزاج فلسفیانہ ہے۔ دنیا میں انسان کے اختیار میں کون کون سی چیزیں ہیں اور وہ کس طرح اپنی کامیابی کی نئی نئی منزلیں تلاش کرتا ہے، اسی بات کو شاعر نے نظم میں بیان کیا ہے۔
- انسان اپنے ارتقا کے سفر میں اچھے برے ہر طرح کے تجربوں سے گزرتا ہے۔ کبھی ناکام ہوتا ہے کبھی کامیاب ہوتا ہے۔ لیکن اسے نہ تو ہمت ہارنا چاہیے نہ اپنے سفر سے منہ موڑنا چاہیے۔ شاعر نے نظم میں یہی پیغام دیا ہے اور بتایا ہے کہ کامرانی کی منزل ہمارا انتظار کر رہی ہے۔
- نظم میں بعض اصطلاحیں بھی استعمال ہوئی ہیں۔ جیسے۔ مشیّت، جبر وقدر، حکمت، امکان، تحتِ شعور، گہوارۂ خودی، خیر وشر آپ اپنے استاد کی مدد سے اِن اصطلاحوں کا مفہوم سمجھیے۔

سوالات

1. شاعر نے انسان کی ترقی کے سلسلے میں کن رکاوٹوں کا ذکر کیا ہے؟ بتائیے۔
2. ''لغزش سے تجربہ ہے اور تجربے سے حکمت'' شاعر اس مصرعے میں کیا کہنا چاہتا ہے، لکھیے۔
3. انسان نے اس کائنات کو اپنی کوششوں سے کس طرح خوش رنگ اور کارآمد بنایا ہے؟
4. ''خود اپنی زندگی کا معمار بن رہا ہوں'' اس مصرعے کا مطلب کیا ہے؟

عملی کام

- انسانی ارتقا اور تہذیب کی ترقی کے موضوع پر ایک مضمون لکھیے۔

ن۔م۔راشدؔ

1910 تا 1975

راشدؔ کا نام نذر محمد تھا۔ وہ گجرانوالہ کے رہنے والے تھے۔ اپنی جوانی کے دور میں وہ کچھ عرصے تک خاکسار تحریک سے بھی متاثر رہے۔ مشرق پر مغرب کی بالادستی اور مغرب کے ہاتھوں مشرق کے سیاسی استحصال کے خلاف راشدؔ نے کھل کر آواز بلند کی۔ اپنی عملی زندگی کے آغاز میں راشدؔ کچھ دنوں تک آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے۔ زندگی کا خاصا بڑا حصّہ ملازمت کے سلسلے میں انھوں نے ایران میں اور پھر یو۔این۔او میں گزارا۔ ان کا پہلا مجموعہ ''ماورا'' اردو شاعری میں ایک نئے طرزِ احساس اور اظہار کا ترجمان ہے۔ ''ماورا'' کے بعد راشدؔ کے جو شعری مجموعے شائع ہوئے، ان کے نام اس طرح ہیں: ''ایران میں اجنبی''، ''لا=انسان'' اور ''گماں کا ممکن'' ان کا کلّیات بھی شائع ہو چکا ہے۔ نثر میں ان کی کتاب ''جدید فارسی شاعری'' مشہور ہے۔

راشدؔ کی شاعری کا سب سے بڑا امتیاز ان کی دانشورانہ حسّیت ہے۔ اقبالؔ کے بعد اپنی شاعری کے وسیلے سے راشدؔ نے مشرق کی فکر اور دانشورانہ روایت کو ایک نئی جہت دی ہے۔ ''ماورا'' کی اشاعت کے دور میں راشدؔ اور میراجیؔ کی نظموں کو مبہم اور لایعنی بھی کہا گیا۔ لیکن جیسے جیسے شاعری کا مذاق بدلتا گیا، راشدؔ اور میراجیؔ کے شعری محاسن اور ان کی ادبی خدمات کا اعتراف بھی عام ہوتا گیا۔ راشدؔ کا شمار بیسویں صدی کے اہم ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔

زندگی سے ڈرتے ہو؟

زندگی سے ڈرتے ہو؟
زندگی تو تم بھی ہو، زندگی تو ہم بھی ہیں!
آدمی سے ڈرتے ہو؟
آدمی تو تم بھی ہو، آدمی تو ہم بھی ہیں!

آدمی زباں بھی ہے، آدمی بیاں بھی ہے
اس سے تم نہیں ڈرتے!
حرف اور معنی کے رشتہ ہائے آہن سے، آدمی ہے وابستہ
آدمی کے دامن سے زندگی ہے وابستہ
اس سے تم نہیں ڈرتے!
''اَن کہی'' سے ڈرتے ہو!
جو ابھی نہیں آئی، اُس گھڑی سے ڈرتے ہو
اُس گھڑی کی آمد کی آگہی سے ڈرتے ہو!

پہلے بھی تو گزرے ہیں،
دور نارسائی کے ''بے ریا'' خدائی کے
پھر بھی یہ سمجھتے ہو، ہیچ آرزومندی
یہ شبِ زباں بندی، ہے رہِ خداوندی!
تم مگر یہ کیا جانو،

لب اگر نہیں ہلتے، ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں
ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں، راہ کا نشاں بن کر
نور کی زباں بن کر
ہاتھ بول اٹھتے ہیں، صبح کی اذاں بن کر
روشنی سے ڈرتے ہو؟
روشنی تو تم بھی ہو، روشنی تو ہم بھی ہیں،
روشنی سے ڈرتے ہو؟

شہر کی فصیلوں پر
دیو کا جو سایہ تھا پاک ہو گیا آخر
رات کا لبادہ بھی
چاک ہو گیا آخر، خاک ہو گیا آخر
اژدہامِ انساں سے فرد کی نوا آئی
ذات کی صدا آئی
راہِ شوق میں جیسے راہرو کا خوں لپکے
اک نیا جنوں لپکے!
آدمی چھلک اٹھے
آدمی ہنسے دیکھو، شہر پھر بسے دیکھو
تم ابھی سے ڈرتے ہو؟
ہاں ابھی تو تم بھی ہو، ہاں ابھی تو ہم بھی ہیں،
تم ابھی سے ڈرتے ہو!

(ن۔م۔راشدؔ)

مشق

لفظ و معنی

رشتہ ہائے آہن	:	آہنی رشتے، مضبوط تعلق
وابستہ	:	متعلق، جڑا ہوا
آگہی	:	آگاہی، علم
نارسائی	:	نہ پہنچ پانا، ناکامی
بے ریا	:	نمود و نمائش سے پاک
ہیچ	:	بے معنی، بے حقیقت، لاحاصل
آرزومندی	:	دل میں نئی نئی تمناؤں کا پیدا ہونا، امیدیں باندھنا
زباں بندی	:	زبان بند کر دیا جانا
فصیل	:	دیوار، چہار دیواری
لبادہ	:	لباس، کپڑا

غور کرنے کی بات

- اس نظم میں شاعر نے یہ بتایا ہے کہ انسان اس کائنات میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے اپنی ذمّے داریوں کو سمجھنا چاہیے اور زندگی کے سلسلے کو آگے بڑھاتے رہنا چاہیے۔ زندگی ایک مستقل امکان کا نام ہے۔

سوالات

1. اس نظم میں شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟
2. ''جو ابھی نہیں آئی اس گھڑی سے ڈرتے ہو'' شاعر نے یہ کیوں کہا ہے؟
3. ''آدمی کے دامن سے زندگی ہے وابستہ'' اس کا مطلب کیا ہے؟

عملی کام

- اس نظم سے آپ تین تراکیب منتخب کیجیے۔
- اس نظم کے چند ہم قافیہ الفاظ کو جمع کیجیے۔
- اس نظم سے چند ایسے مصرعوں کو یکجا کیجیے جن میں ردیفوں کا استعمال ہوا ہو۔

عمیقؔ حنفی

1928 تا 1988

عمیقؔ حنفی مہو چھاؤنی ضلع اندور (مدھیہ پردیش) میں پیدا ہوئے۔اُن کا پورا نام عبدالعزیز حنفی تھا۔عمیقؔ حنفی کی ابتدائی تعلیم مہو میں ہوئی۔اعلیٰ تعلیم کے لیے انھوں نے اندور کی راہ لی۔سیاسیات اور تاریخ میں ایم۔اے کیا۔فلسفے سے انھیں خاص دل چسپی تھی۔ ان کے فکر وفن پر ان علوم کا اثر آخر تک قائم رہا۔طویل مدت تک آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کی۔اسٹیشن ڈائریکٹر کی حیثیت سے 1987 میں سبکدوش ہوئے۔ان کا انتقال دلی میں ہوا۔

عمیقؔ حنفی موسیقی کے بھی بڑے دلدادہ تھے۔انھوں نے باقاعدگی سے موسیقی کا علم حاصل کیا تھا۔موسیقی کے فن کی باریکیوں پر انھوں نے بعض بہت عمدہ مضامین لکھے ہیں۔اردو کے علاوہ انگریزی اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔''شعلے کی شناخت'' اور'' شعر چیزے دیگر است'' ان کی تنقیدی کتابیں ہیں۔

عمیقؔ حنفی نے اپنا ادبی سفر ترقی پسند تحریک کے عروج کے دور سے شروع کیا۔ان کا پہلا مجموعۂ کلام'' سنگ پیراہن'' اسی دور سے تعلق رکھتا ہے۔اس کے بعد وہ جدیدیت کے زیر اثر آ گئے۔کئی شعری تجربے کیے۔متعدد طویل نظمیں بھی لکھیں،جنھیں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ان میں'' سندباد''،'' شہرزاد''،'' سیارگاں''،'' شب گشت''،'' صوت الناقوس'' اور'' صلصلۃ الجرس'' کی خاص اہمیت ہے۔'' آئینے کا کورس'' ان کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔

ملکِ بے سحر و شام

کچھ برس پہلے سویرے منھ اندھیرے
اک پہاڑی پر پہنچ جاتے تھے ہم
ایک کالے سخت تکیے سے اٹھا کر اپنا سر
ادھ جگا سورج ابھر کر دیکھ لیتا تھا ہمیں!
ہم سحر خیزوں سے شرما کر جھکا لیتا تھا سر
دفعتاً اس کے لبوں سے پھوٹ پڑتی تھی ہنسی
ہاتھ وہ ہم سے ملاتا تھا بہ صد حسنِ تپاک
جسم و جاں میں پھیل جاتی تھی شگفتہ تازگی

شام کو جب جھیل کے پانی میں ڈالے اپنے پانو
دائرہ در دائرہ موجیں اٹھا دیتے تھے ہم
تب تھکا ماندہ، انیندا، مضمحل سورج
اپنے خوابستان میں روپوش ہو جانے سے قبل
مسکرا کر ہم سے کہتا شب بخیر
اور چل پڑتے تھے ہم سب اپنے گھر
اپنے دل کی دائرہ در دائرہ موجوں میں سورج گھیر کر

اور اب؟
اب تو یہ بھی یاد رکھنا ہے محال
کس طرف پورب ہے، پچھّم ہے کدھر،
کب اگا کرتا ہے سورج اور کب جاتا ہے ڈوب!
کس کو بستر میں پتہ!
کس کو دفتر میں خبر!

(عمیقؔ حنفی)

مشق

لفظ و معنی

تپاک	:	گرم جوشی
بہ صد حسنِ تپاک	:	بے حد گرم جوشی کے ساتھ
انیندا	:	ادھ جگا
مُضمحل	:	نڈھال
خوابستان	:	خوابوں کی سرزمین
روپوش	:	غائب
محال	:	مشکل

غور کرنے کی بات

- سب سے پہلے اس نظم کے عنوان پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ شاعر نے اپنے عہد کے ماحول کو سامنے رکھ کر یہ عنوان قائم کیا ہے۔ یعنی نئے زمانے کی ضرورتوں اور تقاضوں نے ہمیں ایسی کئی چیزوں سے محروم کر دیا ہے جن سے ہم روحانی مسرت حاصل کرتے تھے۔ ہم اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لیے اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ ہمیں یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ صبح سویرے کب سورج طلوع ہوتا ہے اور کس لمحے وہ ڈوب جاتا ہے۔ گویا اب ہم ایک ایسے ملک کے باسی ہو کر رہ گئے ہیں جس کی کوئی صبح ہوتی ہے نہ شام۔ شاعر نے اصل میں فطرت سے دوری کے المیے کو موضوع بنایا ہے۔ وہ بڑی حسرت سے ماضی کے اُن دنوں کو یاد کرتا ہے جب صبح سویرے اُٹھ کر وہ تازہ دم سورج کے طلوع ہونے کا خوبصورت منظر دیکھا کرتا تھا۔ سورج اس کا بڑی گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کرتا تھا۔ آناً فاناً اس کے جسم و جاں میں وہ ایک نئی روح پھونک دیتا تھا۔ اس کے بعد شاعر اس نظم کے آخری حصے میں گذشتہ شاموں کا ذکر کرتا ہے۔ اسے وہ جھیل کے پانی میں پانو ڈال کر بیٹھنا اور غروب ہونے سے قبل سورج کا شب بخیر کہنا یاد آتا ہے۔

سوالات

1. شاعر اپنے ماضی کی صبحوں کو کس لیے یاد کرتا ہے؟
2. شاعر کو اپنی گذشتہ شامیں کیوں یاد آتی ہیں؟
3. شاعر کے لیے کیا یاد رکھنا محال ہے؟

عملی کام

- ''صلصلۃ الجرس''، عمیقؔ حنفی کی مشہور نعتیہ نظم ہے اسے تلاش کر کے پڑھیے۔

شفیق فاطمہ شعریٰؔ

1930

شفیق فاطمہ شعریٰؔ کی پیدائش ناگپور میں1930 میں ہوئی۔عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔بی۔اے کاامتحان عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد اورایم۔اے کاامتحان ناگپور یونیورسٹی سے پاس کیا۔شعریٰؔ نے ممتاز کالج حیدرآباد میں اردو کی استاد کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا اور یہیں سے سبکدوش ہوئیں۔اس وقت ان کا قیام حیدرآباد میں ہے۔

شعریٰؔ کا پہلا مجموعہ'' آفاقِ نوا'' حیدرآباد سے دسمبر1987 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں صرف نظمیں ہیں ۔ دوسرا مجموعہ'' گلۂ صفورہ'' کے نام سے مکتبہ جامعہ،نئی دہلی سے نومبر1990 میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ بھی ایک غزل اور چند قطعات کے علاوہ نظموں پر مشتمل ہے۔'' سلسلۂ مکالمات'' کے نام سے شعریٰ کا کلیات 2006 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا ہے۔

شعریٰؔ بنیادی طور پر نظم کی شاعرہ ہیں۔ان کی نظموں کا اسلوب اور مرکزی خیال اتنا منفرد ہوتا ہے کہ کبھی کبھی نظم بہت پیچیدہ معلوم ہوتی ہے اور نظم کا مفہوم پوری طرح گرفت میں نہیں آتا۔اکثر نظموں میں شعریٰؔ نے اسلامی تاریخ اور قرآنی واقعات سے بھی مدد لی ہے۔انھوں نے موجودہ زمانے کے تہذیبی اور سیاسی مسائل کو جس انداز سے نظموں کا موضوع بنایا ہے، اس سے بھی ان کا منفرد اسلوب نمایاں ہوتا ہے۔

'' یادنگر'' ایک نمائندہ نظم ہے اس نظم کا آہنگ اور اس کا مخصوص نغمہ قاری کو متوجہ کرتا ہے۔اس نظم میں وطن سے دوری یا جلاوطنی کے احساس کو بہت خوبی سے نظم کیا گیا ہے۔

یادنگر

میں اوس بن کے برس جاؤں تیرے سبزے پر
میں گیت بن کے تری وادیوں میں کھو جاؤں
بس ایک بار بلالے مجھے وطن میرے
کہ تیری خاک کے دامن میں چھپ کے سو جاؤں

شگفتہ گھاس میں یہ زرد زرد ننھے پھول
نہ جانے کس لیے پگڈنڈیوں کو تکتے ہیں
انھیں خبر ہی نہیں ان کو چننے والے آج
گھروں سے دور کسی کیمپ میں سسکتے ہیں

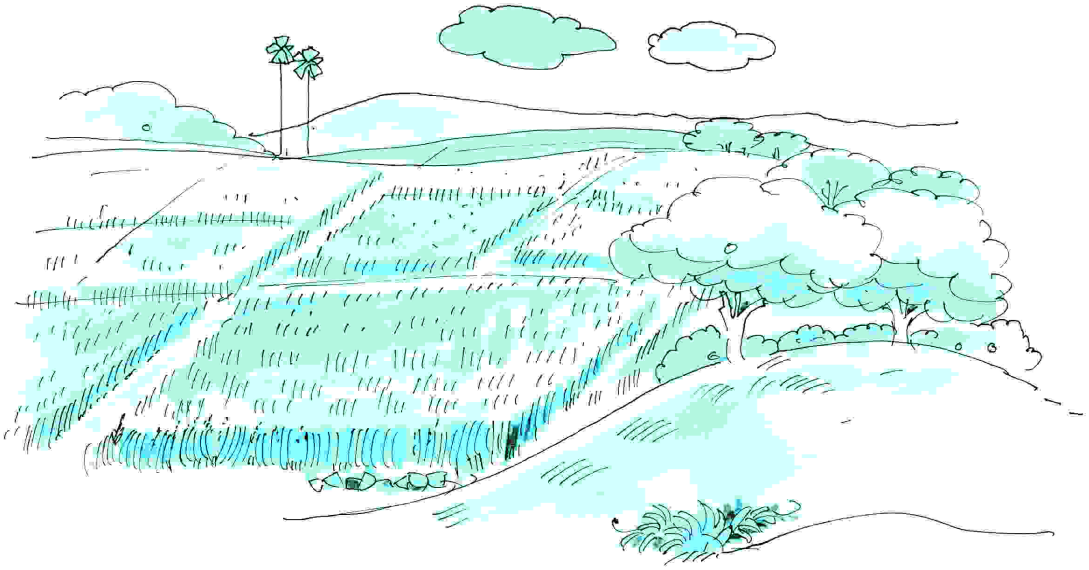

کئی گھرانوں کی فریاد اس میں ڈوب گئی
اب اس کنوئیں پہ نہ آئے گی کوئی پنہاری
کسان کھیت نہ سینچیں گے ایسے پانی سے
ہری نہ ہوگی اسے پی کے کوئی پھُلواری

یہیں ندی کے کنارے اسے دبایا تھا
مگر شبانوں کو وہ بارہا نظر آئی
ہٹی جو ریت تو چمکا وہ چاند سا ماتھا
چلی ہوا تو وہ ریشم سی زلف لہرائی

میں تیرے پانو پڑوں، ہاتھ روک لے قاتل
اسے نہ مار جو تیری طرف ہمکتا ہے
یہ تیغ کو بھی کھلونا سمجھنے والا ہے
یہ لعل پھینک کے انگارہ چوس سکتا ہے

کہا کسی نے کہ وہ جلد لوٹ آئیں گے
کہا کسی نے کہ امید اب بہت کم ہے
الٰہی ڈوبتے دل کو ذرا سہارا دے
مرے چراغ کی لو آج کتنی مدّھم ہے

نبولی نیم کی پکّی، اب آئے گا ساون
مگر یہ گیت اسے آہ کیسے یاد آیا
وہ اپنی ماں سے لپٹ کر نہ رو سکے گی کبھی
نہ سر پہ ہاتھ کبھی رکھ سکے گا ماں جایا

سُنا ہے نیند میں وہ چونک چونک پڑتے ہیں
لہو کے داغ تھے جن پر، وہ ہاتھ جلتے ہیں
پڑوسیوں سے یہ کہہ دو وہ مشعلیں رکھ دیں
کہ ایک گانو کے گھر ساتھ ساتھ جلتے ہیں

الٰہی شام اب اس گانو میں نہ آنے پائے
کہ اس کے آتے ہی دکھیائیں مل کے روتی ہیں
درندے اپنے بھٹوں میں دہلنے لگتے ہیں
ہوائیں کوہ سے ٹکرا کے جان کھوتی ہیں

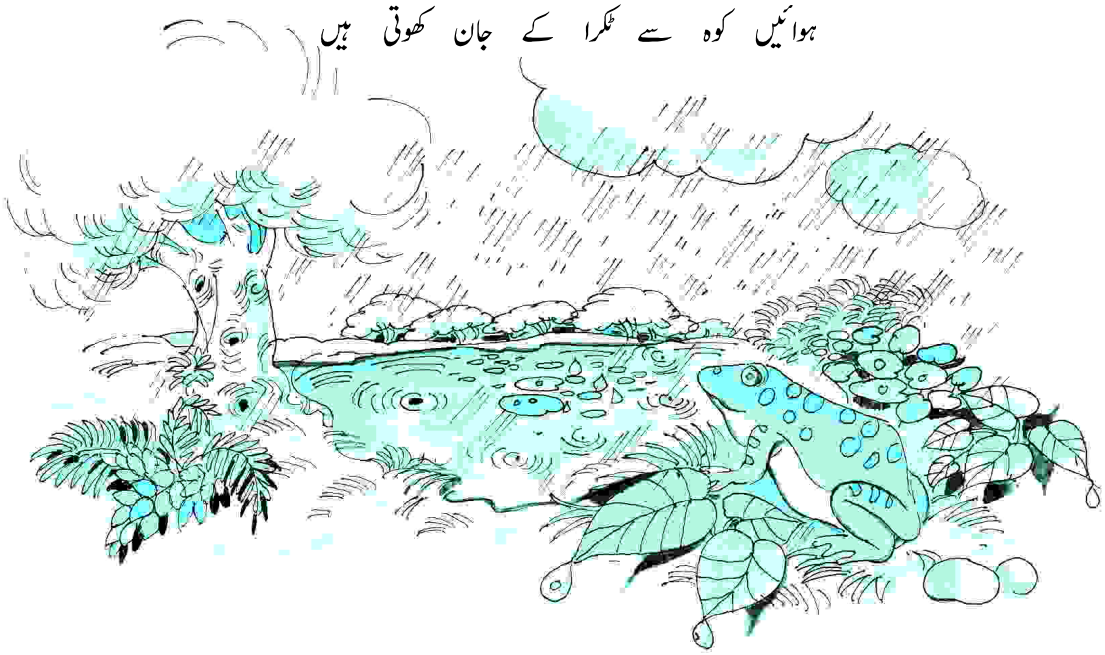

دیے کے واسطے ننّھے پناہ گیر نہ رو
فلک پہ دیکھ وہ قندیلِ ماہ روشن ہے
اسی فضا میں مرے چاند تو بھی اُبھرے گا
جو تو ہے ساتھ تو غربت کی راہ روشن ہے

طلائی گھاس سے وادی میں تھا تلاطم سا
ہوا میں نرم شعاعوں کی سرسراہٹ تھی
نیا تھا چشمۂ مہر اور نیا تھا رنگِ سپہر
ہر ایک گوشہ میں لیکن اجل کی آہٹ تھی

ہوا نے دیپ بجھایا ہی تھا کہ نکلا چاند
قلم کو تیز چلاؤ کہ یہ بھی ڈوب نہ جائے
خود اپنے دل کے اجالے کا اعتبار نہیں
کہ ایک بار یہ جائے تو پھر پلٹ کے نہ آئے

یہ چاندنی کا اُجالا، یہ نیم شب کا سکوں
سفید گنبد و در دودھ میں نہائے ہوئے
ستارو! کوئی کہانی کہو کہ رات کٹے
نہ یاد آئیں مجھے روز و شب بھلائے ہوئے

(شفیق فاطمہ شعریٰ)

مشق

لفظ و معنی

شبانوں	:	شبان کی جمع، چرواہے
ماں جایا	:	بھائی
دکھیائیں	:	غم زدہ عورتیں
قندیل	:	چراغ، لالٹین
غُربت	:	پردیس
طلائی	:	سنہری
تلاطم	:	طوفان
شعاع	:	کرن
مہر	:	سورج
سپہر	:	آسمان
نیم شب	:	آدھی رات
پناہ گیر	:	پناہ لینے والا

غور کرنے کی بات

- نظم میں قتل و غارت گری کے الفاظ نظم کے مرکزی خیال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔
- شاعرہ وطن سے دور جا کر وطن سے متعلق چیزوں کو یاد کرتی ہے۔
- نظم کی فضا غم انگیز اور دردناک ہے۔

سوالات

1. نظم کا مرکزی خیال کیا ہے؟
2. نظم کا عنوان ''یادنگر'' نظم کے لیے کتنا موزوں ہے؟
3. ''الٰہی شام اب اس گانو میں نہ آنے پائے'' اس بند میں نظم کا کردار شام سے کیوں خوف زدہ معلوم ہوتا ہے؟
4. نظم کے آخری مصرعے میں نظم کا کردار ''بھلائے ہوئے روز و شب'' کو کیوں نہیں یاد کرنا چاہتا؟

عملی کام

- اپنی پسند کے تین بند یاد کر کے اُستاد کو سنائیے۔
- نظم کے چوتھے اور پانچویں بند کی تشریح کیجیے۔

طویل نظم

اردو میں مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ بھی طویل نظمیں کہی جاسکتی ہیں۔ لیکن طویل نظم دراصل نظم کی ایک خاص قسم ہے جس کا چلن پہلی جنگ عظیم (1914) کے بعد عام ہوا۔ پہلی مشہور ترین طویل نظم انگریزی کے ممتاز شاعر ٹی ایس ایلیٹ کی The Wasteland ہے۔ شاعری کے بعض نقادوں کا خیال ہے کہ طویل نظم ایک طرح کا تخلیقی مقالہ ہوتا ہے۔ اپنی وسعت اور طوالت کے باعث طویل نظم میں یہ گنجائش رہتی ہے کہ شعری تجربے کا اظہار تسلسل کے ساتھ اور مربوط طریقے سے کیا جائے۔ طویل نظم کی ہیئت متعین نہیں ہے۔ یہ نظم عام طور پر ابتدا سے اختتام تک ایک ہی بحر میں کہی جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مختلف بحروں کو ایک ہی نظم میں استعمال کیا جائے۔

ظاہری اعتبار سے طویل نظم کی ایک معروف مثال ''مسدّسِ حالؔی'' ہے اور اقبالؔ کی بعض نظمیں ''خضرِ راہ''، ''مسجدِ قرطبہ''، ''ذوق وشوق'' بھی طویل نظمیں ہیں۔ ان نظموں کی ہیئت روایتی ہے۔ طویل نظم کی ہیئت میں بڑے اور انقلابی تجربوں کا سلسلہ سردار جعفری کی نظموں سے شروع ہوا۔ ''نئی دنیا کو سلام'' اور ''ایشیا جاگ اٹھا'' ان کی مشہور طویل نظمیں ہیں۔ اردو کی مشہور طویل نظمیں جنھیں بہت مقبولیت ملی، یہ ہیں: حسنِ کوزہ گر (ن م راشدؔ)، ٹھٹھ (جعفر طاہر)، پرچھائیاں (ساحؔر لدھیانوی)، آدھی صدی کے بعد (وزیر آغا)، سند باد، شہر زاد، شب گشت، صلصلۃ الجرس، سیارگاں، صوت الناقوس (عمیق حنفی)، ولاس یاترا (کمار پاشی)۔ مشرق ومغرب کی تقریباً تمام زبانوں میں طویل نظمیں لکھی جارہی ہیں۔

علی سردار جعفری

1913 تا 2000

علی سردار جعفری بلرام پور (اتّر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ، دہلی اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کی عمر 23/ 24 سال رہی ہوگی جب اردو میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ یہ ابتدا ہی سے اس تحریک میں شامل ہوگئے۔ لکھنؤ میں سبطِ حسن اور مجاز کے ساتھ مل کر انھوں نے ''نیا ادب'' کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔ بعد میں وہ بمبئی چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ انتقال بمبئی میں ہوا۔

سردار جعفری شاعر بھی ہیں اور نقاد بھی ''خون کی لکیر''، ''ایشا جاگ اٹھا'' ان کے ابتدائی شعری مجموعے ہیں۔ بعد کے مجموعوں میں ''ایک خواب اور''، ''پیراہنِ شرر'' اور ''لہو پکارتا ہے'' قابلِ ذکر ہیں۔

سردار جعفری کا شمار ترقی پسند فکر کے نمائندہ ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' اس تحریک سے متعلق ایک اہم کتاب ہے۔ انھوں نے ''گفتگو'' کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالا۔ کبیر، میر اور غالب سے انھیں بہت دل چسپی تھی۔ انھوں نے ان تینوں کا کلام اردو اور دیوناگری رسم خط میں اپنے تعارفی مقدموں کے ساتھ شائع کیا ہے۔

سردار جعفری کی شعری تخلیقات میں ''نئی دنیا کو سلام'' ایک طویل نظم ہے۔ سردار نے یہ نظم ہندوستان کی آزادی سے ایک سال پہلے 1946 میں لکھی تھی۔ نظم کا بنیادی موضوع مغربی سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت ہے۔ جدو جہد اور انقلاب کی دعوت کے بعد نظم ایک خوشگوار مستقبل کی امید پر ختم ہوتی ہے۔ نظم کا انداز تمثیلی ہے۔

وقت کا ترانہ

تو نے لاکھوں بہاریں دیکھی ہیں
اب کی اس ملک کی بہار ہے اور
وادیاں گونجتی ہیں نعروں سے
ساز و آہنگِ آبشار ہے اور

قافلہ انقلاب کا ہے رواں
بج رہی ہے خوشی کی شہنائی
زلزلوں سے دہل رہی ہے زمیں
لے رہے ہیں پہاڑ انگڑائی

سُلگ اُٹھی ہے انتقام کی آگ
برف کی چوٹیاں دہکتی ہیں
ظلم اور جبر کے اندھیرے میں
سیکڑوں بجلیاں چمکتی ہیں

جن کو کُچلا گیا ہے صدیوں سے
آج تک ان کے دل دھڑکتے ہیں
زندگی کے بجھے ہوئے شعلے
اک نئی شان سے بھڑکتے ہیں

فصل کے ساتھ ساتھ کھیتوں سے
اُگ رہی ہے بغاوتوں کی سپاہ
جگمگاتی ہے عدل کی شمشیر
مل سکے گی نہ ظالموں کو پناہ

کارخانوں کے آہنی دل سے
ایک سیلاب سا اُبلتا ہے
سرخ پرچم ہوا کے سینے پر
بن کے رنگِ شفق مچلتا ہے

یہی ہندوستاں کا ساحل ہے
جس پہ ٹوٹا غرورِ سلطانی
آگ سی لگ گئی ہے پانی میں
موجیں کرتی ہیں شعلہ افشانی

بادباں کھُل گئے بغاوت کے
بمبئی کے جہازیوں کو سلام
جو شہنشاہیت سے ٹکرائے
ایسے جاں باز غازیوں کو سلام

دیدنی اہلِ شہر کا ہے شکوہ
گولیاں روکتے ہیں سینوں پر
لب پہ نعرے، نگہ میں عزمِ جہاد
حُرّیت ضو فگن جبینوں پر

ہر سڑک پر سمندروں کا اُبال
ہر گلی میں ہے جوشِ طوفانی
غرق کردے گی بادشاہی کو
آدمی کے لہو کی طغیانی

(سردارؔ جعفری)

مشق

لفظ و معنی

آبشار	:	جھرنا
شمشیر	:	تلوار
آہنی	:	لوہے سے بنا ہوا
عزم	:	پختہ ارادہ
حرّیت	:	آزادی
ضوفگن	:	روشنی بکھیرنے والا
طغیانی	:	سیلاب،طوفانی کیفیت

غور کرنے کی بات

- اس نظم کے درج ذیل مرکبات دیکھیے

آہنگِ آبشار رنگِ شفق غرورِ سلطانی اہلِ شہر عزمِ جہاد

مرکّبات کی شکلیں ''مرکبِ اضافی'' کہلاتی ہیں۔ مرکبِ اضافی کے پہلے جز کو مضاف اور دوسرے جز کو مضاف الیہ کہتے ہیں۔ مضاف کے آخری حرف پر جو زیر ہوتا ہے اس کو ''کسرۂ اضافت'' کہا جاتا ہے۔ اردو میں مضاف الیہ کا ترجمہ پہلے اور مضاف کا ترجمہ بعد میں کرتے ہیں۔ درمیان میں موقع و محل کے لحاظ سے 'کا'، 'کی'، 'کے' کا اضافہ کرتے ہیں۔ مثلاً 'آہنگِ آبشار' کا ترجمہ ہوگا: جھرنے کا نغمہ

- ''وقت کا ترانہ'' سردار جعفری کی ایک طویل نظم ہے۔ ''جاوید''، ''مریم''، ''فرنگی'' اور ''نامہ بر'' کے کرداروں کے ذریعے اس نظم کے مختلف اجزا ترتیب دیے گئے ہیں۔ پوری نظم آٹھ اجزا پر مشتمل ہے۔ پہلے جز کو ''حرفِ اول'' اور آخری جز کو

''حرفِ آخر'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ بقیہ درمیانی اجزا کے لیے ''پہلی تصویر''، ''دوسری تصویر'' جیسے عنوانات تجویز کیے گئے ہیں۔ پیش نظر اقتباس ''چوتھی تصویر'' میں بادشاہت کے خلاف انقلاب و بغاوت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

سوالات

1. ''کھیتوں سے بغاوتوں کی سپاہ اگنے'' کا کیا مطلب ہے؟
2. ''سرخ پرچم'' کس بات کی علامت ہے؟
3. آدمی کے لہو کی طغیانی بادشاہت کو کس طرح غرق کر دے گی؟

عملی کام

- اس نظم کے کسی پسندیدہ بند کو یاد کر کے کاپی میں لکھیے۔
- اپنی کتاب سے مرکب اضافی کی پانچ مثالیں تلاش کر کے لکھیے۔